بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اشارات

ترجمان القرآن کے گذشتہ شمارے میں ہم نے مذہب اور سیاست کی دوئی اور اس کے منطقی مغالطوں پر بحث کی تھی۔ اس بحث کا ہماری توقع کے عین مطابق مختلف حلقوں میں مختلف ردعمل ہوا ہے اور اس سلسلے میں ہمیں متعدد خطوط ملے ہیں جن میں بعض کا لب ولہجہ انتہائی تند و تیز ہے اور ہماری ان گزارشات کو ایک خاص گروہ پر بے جا حملہ تصور کیا گیا ہے۔ البتہ ان خطوط میں ایک دو خط ایسے بھی ہیں جن میں زبان اگرچہ سخت استعمال کی گئی ہے لیکن ان کے انداز تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے لکھنے والے حقیقت کو سمجھنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ ہم ان خطوط میں سے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں۔

"میں عرصہ سے ترجمان القرآن کا مطالعہ کر رہا ہوں لیکن ایک چیز جو مجھے اور مجھ جیسے ہزاروں آدمیوں پر شاق گزرتی ہے وہ آپ لوگوں کی "سیاست بازی" ہے۔ آپ کے پیش نظر صرف ایک ہی مقصد ہے کہ کسی طرح حکومت پر قبضہ کر لیا جائے۔ یہ اللہ کے دین کی کونسی خدمت ہے۔ آپ کی جماعت ایک سیاسی جماعت ہے مگر اس نے بڑی چالاکی سے اپنے اُوپر مذہب کا لیبل چپکا رکھا ہے۔ کیا ہمارے وہ سارے بزرگ اسلام سے ناواقف اور نابلد تھے جو سیاست سے کنارہ کش رہ کر لوگوں کا تزکیۂ نفس کرتے اور انہیں خدا اور رسول کی اطاعت گزاری کا سبق دیتے تھے۔ سیاست کی باتیں یوں تو آپ کم و بیش ہر شمارے میں کرتے رہتے ہیں لیکن اب کی مرتبہ آپ نے ان لوگوں پر سخت چوٹ کی ہے جو آپ کے غلط مسلک سے اتفاق نہیں رکھتے اور سیاست کی گندی وادی میں قدم رکھے بغیر مسلمانوں کی مذہبی زندگی کو درست کرنے کے لیے تگ و دو کر رہے ہیں۔ چلیئے ہم ایک لمحہ کے لیے یہ بات تسلیم کر لیتے ہیں کہ سیاست بھی اسلام کا

ایک سجدہ ہے۔ دگرچہ میرا ذہن اس بات کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا کہ مکروفریب کا یہ دھندا اسلام جیسے پاکیزہ دین کا کوئی حصہ ہوسکتا ہے) تو کیا یہ بھی ضروری ہے کہ ہم تعمیری تنقید کے ذریعہ حکمرانوں کی اصلاح کرنے کے بجائے ان سے تختِ اقتدار چھیننے کے لیے پنجہ آزمائی کرتے رہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آپ حصولِ اقتدار کی خواہش ترک کر کے حکمرانوں کو وعظ و نصیحت کے ذریعے راہ راست پر لانے کی کوشش کریں تو وہ کوشش زیادہ مؤثر اور کامیاب ہوگی اور باہمی آویزش بھی ختم ہو جائے گی۔ مگر آپ یہ سیدھا اور معقول راستہ اختیار کرنے کے بجائے ہر صاحبِ اقتدار سے اُلجھتے رہتے ہیں۔ مولانا مودودی کی علمیت کا ہر شخص معترف ہے۔ اور مجھے قوی اُمید ہے کہ اگر وہ حکمرانوں کے مقابلے میں حکمرانی کا دعویٰ ترک کر دیں اور اُن کی اصلاح کی کوشش کریں تو تمام حکمران انہیں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھنا شروع کر دیں گے اور ان کی بیشتر باتوں کو توجہ سے سننے پر آمادہ ہو جائیں گے مگر آپ لوگ اپنی تحریروں اور بیان بازیوں سے برسرِاقتدار طبقوں کے اندر چڑ پیدا کر رہے ہیں۔

سیاست و اقتدار زندگی کے متعدد شعبوں میں سے بس ایک شعبہ ہے۔ اگر دوسرے شعبوں کی اصلاح ہو جائے تو یہ شعبہ پھر خود بخود درست ہو جائے گا۔ فرض کیجیے ہمارے پاس دس پیکٹ ہیں جن کی صفائی ہمیں مطلوب ہے۔ ان میں سے ایک پیکٹ کے اندر سیاست بھری ہوئی ہے۔ آخر یہ کہاں کی دانشمندی ہے کہ صرف ایک پیکٹ کو درست کرنے میں سارا وقت ضائع کر دیا جائے۔ کیا صحیح طرزِ عمل یہ نہیں کہ پہلے نو پیکٹ ہر قسم کی آلائشوں سے صاف کر لیے جائیں، پھر دسویں پیکٹ کی طرف توجہ دی جائے اور اگر وہ حسبِ منشا صاف نہ بھی کیا جاسکے تو پھر اُسے یونہی رہنے دیا جائے۔"

ہم نے دو تین خطوط کے یہ مندرجات طوالت کے احساس کے باوجود اس لیے یہاں درج کیے ہیں کہ اسلام کے جسدِ اطہر سے سیاست کی آلائش کو الگ رکھنے کے لیے الفاظ کے تھوڑے بہت اختلاف کے باوجود قریب قریب یہی دلائل اور یہی اسلوبِ بیان اختیار کیا جاتا ہے۔ ان دلائل کے بارے میں ہم اپنی گزارشات کا آغاز اِن خطوط کے آخری حصے سے کرتے ہیں کیونکہ ہمارے نزدیک یہی وہ بنیادی غلط فہمی ہے جس میں

مبتلا ہونے کی وجہ سے لوگ دین کو سیاست سے الگ رکھنے پر مصر ہوتے ہیں۔ اس طرزِ استدلال کی سب سے نمایاں خامی یہ ہے کہ حیاتِ انسانی کے کسی ایک شعبے کو ایک پیکٹ پر قیاس کرکے ایک غلط نظریہ گھڑ لیا گیا ہے اور یہ قیاس تو خود قیاس مع الفارق ہے۔ آپ اگر ایک پیکٹ کے اندر ایک چیز بھر دیں تو دوسرے پیکٹ کی کوئی چیز خود بخود اس میں گھس نہیں سکتی لیکن انسانی زندگی کا ہر شعبہ دوسرے شعبے کے ساتھ اس قدر مربوط ہوتا ہے کہ بسا اوقات ان کے درمیان کوئی حد فاصل قائم کرنا ممکن نہیں ہوتا، مثلاً آپ شعبہ تجارت اور قانون کے درمیان، یا شعبہ قانون اور اخلاق کے درمیان یا تعلیم اور ثقافت کے درمیان یا نظم و نسق اور تہذیب نفس کے درمیان کوئی حد بندی نہیں کرسکتے۔ زندگی کے ان شعبوں کا آپس میں ربط و ضبط اس قدر قریبی ہے کہ ان میں سے کوئی ایک دوسرے کو یہ نہیں کہہ سکتا۔

من دیگرم تو دیگری

ظاہر بات ہے کہ جہاں ایک شعبے کا دوسرے شعبوں سے تعلق اس قدر گہرا ہو وہاں انہیں الگ الگ ڈبوں کی صورت میں ایک دوسرے سے بے تعلق نہیں رکھا جاسکتا۔ وہ ایک دوسرے پر نہایت گہرے اثرات مترتب کرنے کی وجہ سے آپس میں اس قدر ہم رنگ اور ہم آہنگ ہوتے ہیں کہ ان کے مابین تمیز کرنی مشکل ہو جاتی ہے۔ حیاتِ انسانی کے متعدد شعبوں کو نہ تو مختلف اشیاء کے بکھرے ہوئے پیکٹوں پر قیاس کیا جاسکتا ہے اور نہ کسی ملک کے اندر پائے جانے والے جوہڑوں اور تالابوں سے تشبیہہ دی جاسکتی ہے کہ پہلے کسی دوسرے سے تعرض کیے بغیر ایک کو صاف کرلیا جائے اور پھر دوسرے کی طرف توجہ دی جائے۔ زندگی کا دھارا دریا کے بہاؤ کی حیثیت رکھتا ہے جو زندگی کی پوری گذرگاہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے چنانچہ آپ دریا کے بہاؤ کے بارے میں اس بات کا تعین تو کرسکتے ہیں کہ اب یہ پہاڑی علاقے میں سے گذر رہا ہے اور اب میدانی علاقے میں داخل ہو رہا ہے اور پہاڑی علاقے میں سے گذرتے ہوئے اس کے اندر اس نوعیت کی کثافتیں شامل ہوئی ہیں اور میدانی علاقے میں گذرتے ہوئے دوسری نوعیت کی غلاظتیں اس کی سطح پر تیرنے لگی ہیں، مگر آپ اس کے دھارے کے کسی مخصوص حصے کو بہاؤ سے الگ کرکے صاف نہیں کرسکتے۔ آپ کو اگر اس کی صفائی مطلوب ہے تو پورے دھارے کی فکر کرنا ہوگی۔

جو لوگ زندگی کے مختلف شعبوں کو اشیاء کے پیکٹوں کے مشابہ سمجھ کر اس پر کوئی حکم لگاتے ہیں

ان کے بارے میں یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ وہ حیات انسانی کی ابجد تک سے ناواقف ہیں۔ بے جان اشیاء کے چھوٹے چھوٹے تھیلوں کو رواں دواں اور متحرک زندگی کے مختلف شعبوں پر قیاس کرنا انتہائی سادگی ہے، ایسی سادگی جس کے ڈانڈے بیوقوفی سے ملتے نظر آتے ہیں۔

پھر اس انداز پر سوچنے والے لوگ دوسری بڑی غلطی یہ کرتے ہیں کہ ان پیکٹوں کے بارے میں بھی فرض کر لیتے ہیں کہ زندگی کے یہ پیکٹ مختلف مقامات پر بکھرے پڑے رہتے ہیں اور کوئی قوت انھیں نظم اور ترتیب کے ساتھ ایک دوسرے سے وابستہ کرنے والی نہیں ہوتی۔ یہ ایک انتہائی غلط مفروضہ ہے جس پر مذہب اور سیاست کی دوئی کا نظریہ قائم کیا گیا ہے۔ اگر حیات انسانی مختلف پیکٹوں سے عبارت ہے تو پھر بھی ایک ایسی قوت کا وجود ناگزیر ہے جو ان پیکٹوں کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ باہم جوڑ کر رکھے۔ زندگی کے منتشر اور بکھرے ہوئے شعبے کسی نظم اجتماعی کو آخر کس طرح جنم دے سکتے ہیں؟ اگر زندگی کے مختلف شعبوں کو پیکٹوں ہی پر قیاس کرنا ہے تو پھر اس تار کی قوت اور اُس کی بالادستی اور افادیت کو بھی نگاہ میں رکھیے جو ان پیکٹوں کے گرد لپیٹ کر نہ صرف خاص ترتیب کے ساتھ اُنھیں ایک دوسرے سے پیوست رکھتی ہے بلکہ ان کے تحفظ کا سامان بھی بہم پہنچاتی ہے۔ یہ تار حکومت کی قوت ہی ہے۔ اب اگر کوئی شخص کسی خاص پیکٹ کی صفائی کا طالب ہے تو وہ جب تک تار سے اُلجھ کر اور اس کی گرفت کمزور کر کے اپنے دل پسند پیکٹ کو دوسرے پیکٹوں سے الگ کر کے اُسے اپنے قبضہ اختیار میں نہیں لے آتا وہ اس کے صاف کرنے پر کس طرح قادر ہو سکتا ہے۔ آپ اگر کسی مظلوم کو ظلم سے نجات دلانے کی تڑپ رکھتے ہیں تو اس کے لیے بنیادی ضرورت یہ ہے کہ سب سے پہلے اُسے اس پنجہ استبداد سے رہائی دلانے کی کوشش کریں جس کی جکڑبندی میں وہ مظلوم کراہ رہا ہے۔ محض وعظ و نصیحت اور نیکی کی تلقین سے تو مظلوم کے دکھوں کا کوئی مداوا نہیں ہو سکتا۔ بالفرض آپ اگر خود اس سلسلے میں کچھ کرنے سے عاجز ہوں اور اپنی کوششوں کو صرف مظلوم کا حوصلہ بڑھانے تک محدود رکھنا چاہتے ہوں تو پھر بھی اصلاح کی واحد صورت یہی ہوگی کہ مظلوم سب سے پہلے اپنے آپ کو ظالم کے پنجے سے نجات دلانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے اور اس سے آزاد ہونے کی کوشش کرے۔ کیونکہ وہ جب تک اُس سے رہائی حاصل نہیں کر لیتا یا کم از کم اس پنجے کی گرفت کو ڈھیلا کرنے کا انتظام نہیں کر پاتا۔ اُس وقت تک وہ آپ کے نیک مشوروں کی روشنی میں اپنی اصلاح کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا۔ پنجۂ استبداد سے رہائی اصلاح احوال کی بنیادی ضرورت ہے اور

آپ اُسے سیاست بازی کا مکروہ کھیل سمجھ کر اس سے دامن بچانے کا پرچار کرتے ہیں۔

دنیا کا ہر نظامِ زندگی کے مختلف شعبوں کو ایک دوسرے سے مربوط رکھنے کے لیے انہیں اپنی مخصوص جکڑبندیوں میں پوری طرح کس کر رکھتا ہے کیونکہ اس کے حفظ و بقا کا سارا انحصار اسی پر ہوتا ہے اور جو شعبہ حیات یہ فرض سرانجام دیتا ہے وہ سیاست و اقتدار ہے۔ اب اگر آپ ان جکڑ بندیوں سے تو کوئی تعرض نہیں کرتے اور زندگی کے بعض دوسرے شعبے جو اِن کی آہنی گرفت میں ہیں اُن میں اصلاح کرنا چاہتے ہیں تو خود ہی غور فرمائیں کیا آپ کی یہ مقدس خواہش کبھی پوری ہو سکتی ہے؟ ہمیں یہ تسلیم ہے کہ بعض نیک افراد اور گروہوں نے اپنے کام کا آغاز اس انداز سے کیا کہ جیسے اُن کا سیاست سے کوئی دُور کا بھی تعلق نہ تھا لیکن جونہی وہ چند قدم آگے بڑھے اور اُن کے پیغام نے عوام کے اندر حرکت و حرارت پیدا کی تو سیاست کے معاملے میں ان حضرات کی ساری احتیاطی تدابیر کے باوجود اربابِ اختیار نے اُنہیں اور اُن کے کام کو اپنے لیے خطرہ ہی سمجھا۔ انہوں نے جب ان حضرات کی سرگرمیوں کو بڑھتے ہوئے دیکھا اور انہیں اس امر کا احساس ہوا کہ یہ لوگ کسی شعبہ زندگی میں تبدیلی لانا چاہتے ہیں تو وہ فوراً اس بات کو بھانپ گئے کہ ان سرگرمیوں کی زد ان جکڑ بندیوں پر پڑنے والی ہے جن میں انہوں نے عوام کو جکڑ رکھا ہے۔ چنانچہ اُنہوں نے ان "غیر سیاسی سرگرمیوں" کو بھی اسی طرح کچلنے کی کوشش کی جس طرح کہ سیاسی تحریکات کو کچلا جاتا ہے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے جو لوگ ہوسِ اقتدار کی تسکین کے لیے لوگوں کی گردنوں پر مسلط ہوں وہ آخر کس طرح گوارا کر سکتے ہیں کہ کوئی فرد یا جماعت کوئی ایسی تحریک یا پروگرام لے کر اُٹھے جو اصحابِ اقتدار کی گرفت کے لیے اپنے اندر کوئی چیلنج رکھتی ہو۔

تاریخ کے اوراق اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ آج تک دنیا میں جتنے بھی ہادی اور رہنما آتے ہیں ان کی اقتدار سے براہِ راست ٹکر ہوئی یا نہ ہوئی مگر اقتدار نے ان مُصلحین کو اپنے لیے ہمیشہ شدید خطرہ ہی خیال کیا اور پوری قوت سے اُن کا راستہ روکنے کی کوشش کی کیونکہ اصحابِ اقتدار کو اس بات کا اچھی طرح علم تھا کہ ان حضرات کی اصلاحی سرگرمیاں اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتیں جب تک اس نظام کی قوت درہم برہم نہیں ہو جاتی جو انہوں نے عوام پر مسلط کر رکھا ہے۔ غیر سیاسی سرگرمیوں تک اپنے آپ کو محدود رکھ کر اگر کوئی انقلاب لانا ممکن ہوتا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون سے پنجہ آزمائی کر کے بنی اسرائیل کو اس کی غلامی

سے نجات دلانے کی کبھی کوشش نہ کرتے۔ وہ سیاست سے کنارہ کش رہ کر بڑی خاموشی کے ساتھ دعوت و تبلیغ کا کام کرتے۔ مگر اس عارف ربانی کے سامنے یہ حقیقت پوری طرح واضح تھی کہ جس طرح دو تلواریں ایک نیام میں نہیں سما سکتیں اسی طرح دو نظام ہائے حیات ایک وقت میں غالب نہیں ہو سکتے۔ حق کو اگر غالب اور سربلند ہونا ہے تو اس کی ایک ہی صورت ہے کہ باطل سرنگوں ہو یا کم از کم جو لوگ حق کا نفاذ چاہتے ہیں وہ باطل کی عملداری سے نکل جائیں۔

سطح بین لوگوں کی نظر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات اور اُن کی دعوتی سرگرمیوں سے زیادہ غیر سیاسی تعلیمات اور سرگرمیاں کس کی ہو سکتی ہیں مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اقتدار نے ان کے اندر بھی اسی نوعیت کا شدید خطرہ محسوس کیا جو فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات اور سرگرمیوں کے اندر محسوس کیا تھا اور اس مُخبر صادق علیہ السلام کی ساری نیکی، پرہیزگاری، دنیا اور اس کے معاملات سے بظاہر لاتعلقی کے باوجود اُس کے لیے وہ سزا تجویز کی جو اس دنیائے فانی میں کسی انسان کے لیے سب سے زیادہ سنگین سزا تجویز کی جا سکتی ہے۔ اپنی تبلیغی سرگرمیوں کو وعظ و نصیحت تک محدود رکھنے کے باوجود انہیں موت کا حکم سُنایا گیا۔ اس کی وجہ بجز اس کے اور کیا تھی کہ رائج الوقت نظام کے حامیوں کو اس بات کا خطرہ لاحق تھا کہ دعوت و تبلیغ کا یہ "خاموش اور بظاہر بے ضرر سا پروگرام" اگر عوام کی توجہ کا مرکز بن گیا اور ان کے اندر اس پروگرام کے مطابق اصلاح احوال کی تحریک پیدا ہوئی تو اس سے ایوان اقتدار میں لازمی طور پر تزلزل پیدا ہو گا جو بالآخر اُسے پیوند خاک کر دے گا۔

کلمہ طیبہ سے زیادہ روحانی کلمہ اور کونسا ہو سکتا ہے جو صرف اللہ رب العزت کی یکتائی و کبریائی اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے ذکر سے عبارت ہے۔ اس میں سیاست کا کوئی شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ پھر اس میں بظاہر کوئی ایسا اشارہ بھی نہیں ملتا جس سے کسی حکمران سے اس کا تخت و تاج چھیننے کا کوئی اندیشہ موجود ہو مگر اس کے باوجود اس مختصر سے کلمے کو جس میں کائنات کی دو بنیادی حقیقتوں کے اعتراف کے علاوہ اور کسی چیز کا تذکرہ نہیں، سنتے ہی نہ صرف قریش کے سربراہ بلکہ پوری دنیا کے تاجدار تلملا اُٹھے اور عرب کے قبائلی سرداروں سے لے کر روم اور ایران کے قیاصرہ اور اکاسرہ تک سب نے اسے اپنی موت کا پیغام سمجھتے

ہوئے اسے دباتے اور اس پر ایمان لانے والوں کو مٹانے کی کوشش کی۔ قریش کے سردار، یہودیوں اور عیسائیوں مذہبی رہنما، رُوم اور ایران کے حکمران، چین اور منگول کے خاقان و فغفور آخر دیوانے تو نہیں ہو گئے تھے کہ وہ اس "غیر سیاسی کلمے" کو سُنتے ہی بلا وجہ اشتعال میں آجاتے اور اس کلمہ کے علمبرداروں کی مختصر سی جماعت، جو ان کے اپنے بھائی بندوں پر ہی مشتمل تھی، اسے پوری قوت سے مٹانے لگتے۔ اگر اس کلمہ میں عرب و عجم کے قائدین کی قیادت اور سیادت کے لیے کوئی خطرات مضمر نہ تھے تو انہیں اپنے بھائیوں پر دستِ ظلم دراز کرنے کی ضرورت آخر کیوں پیش آئی؟ وجہ صاف ظاہر ہے کہ وہ اس کلمے کے فکری اور عملی مضمرات سے اچھی طرح واقف تھے۔ انھیں اس بات کا پوری طرح علم تھا کہ یہ کلمہ جس ہمہ گیر انقلاب کی دعوت دے رہا ہے اس سے باطل کی سرزمین ناگزیر طور پر زیر و زبر ہونے والی ہے۔ اللہ کی کبریائی کا اظہار کوئی منطقی مفروضہ نہیں بلکہ یہ اس حقیقت کا اعلان ہے کہ سروری صرف اسی ذات بے ہمتا کو زیب دیتی ہے جو اس کائنات کی واحد خالق، مالک اور مدبر ہے اور اس ایک ذات کے علاوہ کبریائی کے سارے دعویدار بتانِ آذری کی حیثیت رکھتے ہیں جنھیں پاش پاش کیے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں۔ پھر رسالتِ محمدیؐ کا اقرار کسی عظیم انسان کی عظمت کا اعتراف ہی نہیں بلکہ یہ اس حقیقت کا پورے جزم و یقین کے ساتھ اقرار ہے کہ آج کے بعد دنیا میں حق کا واحد منبع و سرچشمہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی اور ان کا مقدس پیغام ہے۔ حضورؐ کے ارشادات و فرمودات اور حضورؐ کے افعال و اعمال کی روشنی ہی میں نوعِ انسانی کو حق و باطل کے درمیان تمیز کرنا ہو گی۔ جس بات کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حق قرار دے دیا ہے وہ قیامت تک حق ہی رہے گی اور جس کے باطل ہونے پر آپؐ نے حکم لگا دیا وہ باطل ہی رہے گی خواہ سارے انسان بھی مل کر اُسے حق ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہیں۔ حضورؐ کا قول زندگی کے ہر معاملے میں انفرادی ہو یا اجتماعی قول فیصل کی حیثیت رکھے گا اور حضورؐ کا عمل وہ آخری اور قطعی معیارِ حق ہو گا جسے پیشِ نظر رکھ کر بنی نوعِ انسان اپنے اعمال کو پرکھا اور جانچا کرے گی۔

کلمہ طیبہ کے اس انتہائی فکر انگیز اور ہمہ گیر انقلابی پیغام کو سننے کے بعد اگر باطل اور اس کے پرستار خوفزدہ ہو کر حق کا راستہ روکنے کی جد و جہد نہ کرتے تو کیا کرتے؟ انہیں اپنے تحفظ کے لیے حق کے خلاف صف آرا ہونا ہی تھا اور حق کو اپنی راہ ہموار کرنے کے لیے باطل سے لازمی طور پر ٹکرانا ہی تھا۔ اگر حق و باطل فی الحقیقت ایک دوسرے کی ضد ہیں تو اُن کے مابین تصادم ناگزیر ہے۔ اگر یہ تصادم کچھ مدت کے لیے ٹلتا نظر آتا ہے

(باقی بر صفحہ ۴۶)